سبق: 12

تعلیم القرآن

آن لائن اکیڈمی

(سورۃ یوسف ،آیت 94 تا 111)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

اور جب قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا اگر تم میری عقل کو کمزور نہ سمجھو تو مجھے یقیناً یوسف کی خوشبو آ رہی ہے ﴿94﴾

آیت 94 ﴿ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ . . . : یوسف علیہ السلام کا جو بھائی پیچھے رہ گیا تھا اور جس نے کہا تھا کہ میں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ یا تو وہ مجھے آنے کی اجازت دے یا اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ کر دے، تو رب تعالیٰ نے وہ فیصلہ کر دیا اور سارا راز کھول دیا۔ برادرانِ یوسف کو معلوم ہو گیا کہ مصر کے تخت پر بیٹھنے والا عزیز ان کا بھائی یوسف علیہ السلام ہے۔ اس کے بعد جب انھوں نے اہل و عیال کے ہمراہ مصر آنے کی دعوت دی تو یہ قافلہ بخوشی یوسف (علیہ السلام) کی قمیص لے کر

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ﴿۹۵﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم بے شک آپ اپنی اسی پرانی بھول میں ہیں ﴿95﴾

وہاں سے چل پڑا۔ جب یہ قافلہ مصر سے نکلا تو یعقوب علیہ السلام اپنے گھر والوں سے کہتے ہیں: ﴿اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ ''اگر تم میری عقل کو کمزور نہ سمجھو تو مجھے یقیناً یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔'' ''تُفَنِّدُوْنِ'' کا معنی ہے کہ حواس کام نہیں کر رہے، عقل صحیح کام نہیں کر رہی اور بڑھاپے اور غم کی وجہ سے حالت یہ ہو گئی ہے کہ بندہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کہ اگر تم یہ نہ سمجھو اور میری بات مانو تو آج مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

آیت 95 ﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ: یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر اہل خانہ کہتے ہیں کہ آپ پرانی بھول میں ہیں اور آپ کو اب بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا تھا۔ آپ ہر وقت یہی امید لگائے رہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے اور آپ کو ضرور ملے گا، حالاں کہ یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ یہاں ایک بات سمجھنے کی ہے کہ یوسف علیہ السلام کی قمیص مصر سے لائی جا رہی ہے لیکن یعقوب علیہ السلام کو خوشبو آ گئی ہے۔ بعض لوگ اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ نبی عالم الغیب ہوتا ہے اور اس کے پاس یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اتنی دور سے کسی بات کو معلوم کر لیتا ہے تو یہ باتیں درست نہیں ہیں۔ یہ ساری چیزیں معجزات سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ مصر تو بہت دور ہے جس کنویں میں یوسف علیہ السلام کو پھینکا گیا وہ اس بستی کے قریب ہی تھا لیکن وہاں سے کوئی خوشبو نہیں آئی۔ اگر یعقوب علیہ السلام عالم الغیب ہوتے تو پہلے دن ہی بیٹوں سے کہہ دیتے کہ تم کہتے ہو کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے جبکہ تم تو اسے کنویں میں پھینک کر آئے ہو اور پھر یعقوب علیہ السلام جلدی سے جاتے اور یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر لے آتے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا انھیں کسی چیز کے متعلق علم نہیں ہوا۔

یوسف علیہ السلام کن مراحل سے گزرے باپ کو کچھ پتا نہیں ہے۔ بھائی کس ارادے سے یوسف علیہ السلام کو لے کر جا رہے ہیں اور ان کا آپس میں کیا مشورہ ہوا ہے اس کے بارے میں بھی یعقوب علیہ السلام کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ سارا مشورہ بھی انھوں نے گھر میں رہ کر یا قریب ہی کسی جگہ کیا ہو گا لیکن یعقوب علیہ السلام کو پتا نہیں چل سکا کہ میرے بیٹے اپنے ہی بھائی کو کنویں میں پھینکنے جا رہے ہیں۔ ان کی طرف سے دھوکا دینے پر خدشہ ضرور ظاہر کیا گیا تھا لیکن اگر انھیں اصل بات کا علم ہوتا تو وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ نہ بھیجتے۔ اس لیے یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لیں کہ یعقوب علیہ السلام بھی چونکہ نبی ہیں، لہٰذا رب تعالیٰ نے جس وقت چاہا معجزے کے طور پر ان تک یوسف علیہ السلام کی خوشبو پہنچا دی۔ یہ صحیح عقیدہ ہے اور اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور اہم بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ معجزہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ
اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

پھر جب خوش خبری دینے والا آپہنچا تو اس نے ان کے چہرے پر وہ (قمیص) ڈال دی تو فوراً ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں، کہنے لگے کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿96﴾

پر (بھوک کی وجہ سے) دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ [سنن الترمذي، أبواب الزهد، باب ما جاء في معيشة أصحاب النبي ﷺ: ۲۳۷۱، حسنه زبير علي زئي] اللہ کے رسول ﷺ نے اس وقت کسی سے یہ نہیں کہا کہ اتنے دن بھوکا رہنے کا کیا فائدہ ہے، تم کھانا پکاؤ میں اس میں برکت ڈال دیتا ہوں اور سارے کھالیتے ہیں۔ یعنی معجزہ نبی کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جب اور جیسے چاہتا ہے اپنے نبی کے ہاتھ سے معجزے کا اظہار کروا دیتا ہے۔ یہ عقیدے کی بات ہے جسے توجہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آیت 96 فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ . . . . : بعض لوگ اس آیت سے علم غیب کی دلیل نکالتے ہیں کہ دیکھا یعقوب علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، حالاں کہ بات وہی ہے کہ اس سے پہلے انھیں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب ساری بات کھل گئی تو اللہ رب العالمین نے یہ چیزیں واضح کر دیں۔ اللہ رب العزت بیان فرما رہے ہیں کہ خوش خبری دینے والا قمیص لے کر آ گیا ہے، یا تو یوسف علیہ السلام نے اپنا کوئی نمائندہ قمیص دے کر بھیجا ہو گا یا وہ بڑا بیٹا جو پریشان تھا کہ میں گھر کیسے جاؤں گا، اسے ہی قمیص دے کر بھیج دیا۔ اس سلسلہ میں بہت ساری روایات پیش کی جاتی ہیں لیکن قرآن نے یہ چیز بیان نہیں کی، اس لیے یہ بات سمجھ لیں کہ جس کسی کو بھی یوسف علیہ السلام نے قمیص دے کر بھیجا وہ "الْبَشِيْرُ" یعنی خوش خبری دینے والا تھا۔ بہر حال جب یہ سارے بھائی آ گئے اور قمیص کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا تو "فَارْتَدَّ بَصِيْرًا" ان کی نظر لوٹ آئی۔ وہ ہر چیز صاف دیکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کی بینائی ٹھیک کر دی۔ یہ یوسف علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ قمیص بھیجنے والے یوسف علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں اور جن کی آنکھوں کا علاج ہوا ہے وہ بھی اللہ کے نبی ہیں۔ معجزہ اللہ کے نبی کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں سے بھی رب تعالیٰ غیر معمولی چیزوں کا اظہار کروا دیتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ غیر نبی کے ساتھ ہو تو اسے "کرامت" کہتے ہیں لیکن ہوتی یہ بھی اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ اس میں کسی بزرگ کا اپنا کوئی کمال نہیں ہوتا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ : یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کیا میں تم سے نہیں کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ خواب ہے جو یوسف علیہ السلام

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ

انھوں نے کہا اے ہمارے ابا جان! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کیجیے، بے شک ہم ہی خطا کار تھے ﴿97﴾ کہا

نے دیکھا اور باپ کو بتایا تھا۔ باپ کو امید تھی کہ یہ خواب ضرور پورا ہو کر رہے گا، اسی لیے یعقوب علیہ السلام اس کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ میں تم سے کہتا نہیں تھا کہ یوسف زندہ ہے اور وہ ہم سے ضرور ملے گا، لیکن تم میری اس بات کو مانتے نہیں تھے۔ ان کا اشارہ اس خواب کی طرف ہے جو یوسف علیہ السلام نے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ یوسف کنویں میں تھا اور اسے وہاں سے نکال کر مصر پہنچا دیا گیا ہے، ایسی کوئی چیز یا اشارہ کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔ بات صرف یہی ہے کہ یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر سمجھ گئے تھے، اسی لیے وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ وہ وقت ہر صورت لے کر آئے گا جب یوسف کے ساتھ ان کی ملاقات ہو گی۔

آیت 98،97 ﴿قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ . . . .﴾: یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئی، انھیں ساری حقیقت معلوم ہو گئی اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی مل گیا کہ اب ہم نے یوسف علیہ السلام کے پاس مصر جانا ہے تو پھر بھائی مل کر باپ سے معافیاں مانگنے لگے کہ آپ ہمارے لیے اللہ سے بخشش طلب کیجیے۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ساری غلطی ہماری ہے۔ ہم نے بہت بڑا ظلم کیا کہ یوسف کو دھوکے سے لے جا کر کنویں میں پھینک دیا تھا۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بندے سے بڑے سے بڑا گناہ ہو جائے، اس کا حل رب تعالیٰ سے معافی مانگنا اور بخشش طلب کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بڑا گناہ ہو گیا تو سمجھا جائے کہ اب اس کی معافی نہیں ہو گی۔ خلوصِ نیت کے ساتھ شرک سے توبہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی معاف فرما دیتا ہے حالاں کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ شرک سے معافی مانگنے کے بعد پھر اس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہی رہنا چاہیے۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہوتی ہے کہ بندہ گناہ کرنے کے بعد اپنی غلطی کو دل سے تسلیم کرے اور اپنے رب کی بارگاہ میں سربسجود ہو جائے، نبی ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) [صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب تعديل النساء بعضهن بعضا: ٢٦٦١] ”بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔“

اللہ رب العالمین فرماتے ہیں: ﴿وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [الفرقان: ٦٨ تا ٧٠] ”اور وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہیں پکارتے اور نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل کرتے

رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۹۸﴾

میں عنقریب اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿98﴾

ہیں اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو ایسا کرے گا وہ سخت سزا پائے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ ذلیل ہو کر اس میں پڑا رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''

ان آیات میں تین بڑے گناہوں کا ذکر ہے، پہلا شرک ہے جو کہ اکبر الکبائر ہے، دوسرا بڑا گناہ قتل ہے اور تیسرا زنا ہے۔ ان تینوں گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ جو کوئی توبہ کرنے کے بعد اپنی اصلاح کر لے، اپنے رویے تبدیل کرے اور عمل صالح اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں بندہ سمجھے کہ اب اس کی معافی نہیں ہے۔ موت کے آثار نمودار ہونے اور سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک سب انسانوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) [صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه : ۲۷۰۳] ''جس شخص نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لے گا۔''

ایک اور روایت میں ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ، وَلَا تَنْقَطِعُ التَّوْبَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا)) [سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الهجرة هل انقطعت : ۲٤۷۹، صحيح عند الألباني] ''ہجرت ختم نہیں ہو سکتی حتی کہ توبہ منقطع ہو جائے اور توبہ اس وقت تک منقطع نہیں ہو گی حتی کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے۔'' گویا ہر مسئلہ میں استغفار کرنا اور توبہ کرنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ . . . : یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے سبھی بہت خوش تھے اور اس خوشی میں اللہ کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ بیٹوں کو غلطی کا احساس ہے تو باپ بھی کہہ رہا ہے کہ میں عنقریب اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش کی دعا کروں گا، اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ اس میں ہمارے لیے سبق ہے کہ جب کبھی کوئی خوشی ملے تو خالقِ کائنات کی طرف رجوع سب سے زیادہ ہونا چاہیے اور اس موقع پر بھی اپنی غلطیوں کو پیش کر کے استغفار کرنا چاہیے۔ بسا اوقات لوگ خوشی کے موقع پر بھی ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ یہ گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ حقیقی خوشی کے اظہار کا طریقہ یہ ہے کہ عاجزی اختیار کی جائے اور معافی مانگی جائے۔

مفسرین نے یہاں یہ بحث بھی کی ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں عنقریب اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش کی دعا کروں گا۔ "سَوْفَ" کا معنی تاخیر ہوتا ہے کہ کچھ دیر ٹھہر کر کروں گا۔مفسرین نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام درحقیقت دیکھنا چاہتے تھے کہ یوسف علیہ السلام جن کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہوا ہے انھوں نے معاف کیا ہے یا نہیں۔ ان کا اپنے بھائیوں کے ساتھ رویہ کیسا ہے اور وہ ان کے لیے کوئی سزا تو تجویز نہیں کرتے؟اسی طرح دوسری بات یہ کہ یعقوب (علیہ السلام) کے ساتھ بھی بہت بڑی زیادتی ہوئی تھی کہ بیٹوں کے اس ظلم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور ان کی بینائی جاتی رہی، اس لیے باپ کے دل میں ناراضی کا ہونا بھی فطری امر تھا، لہٰذا انھوں نے فوراً معافی طلب کرنے کی بجائے وعدہ کیا تھا کہ میں اللہ سے ضرور معافی مانگوں گا جو کہ یقیناً انھوں نے پورا کیا ہوگا۔ یہ ساری باتیں ممکن ہوسکتی ہیں، البتہ سیاقِ کلام سے یہی بات ظاہر ہو رہی ہے کہ انھوں نے محض تاخیر کرنے کے لیے یہ بات نہیں کی تھی بلکہ کہا تھا کہ میں تمھارے لیے مغفرت ضرور طلب کروں گا۔بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں جمعرات کو معافی مانگوں گا۔ اسی طرح یہ بھی بیان ہوا ہے کہ انھوں نے کہا تھا جمعہ کی رات بڑی مقرب ہوتی ہے، میں اس وقت بخشش طلب کروں گا لیکن یہ باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہیں۔ ماں باپ کی دعائیں اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہیں۔ اولاد کو اپنے ماں باپ سے دعائیں لینی چاہییں اور والدین کو بھی ہر حال میں اپنی دعاؤں میں اپنی اولاد کو شامل رکھنا چاہیے۔

الادب المفرد میں ہے کہ ایک شخص نے کسی معشوقہ عورت کو قتل کر دیا، پھر اسے ندامت ہوئی وہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا کہ اور کہا توبہ کی کوئی صورت ہو تو بتائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: کیا تیری والدہ زندہ ہے؟اس شخص نے کہا: نہیں۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ توبہ کر اور جس قدر ہو سکے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کر (ہوسکتا ہے اللہ تیرا گناہ بخش دے) عطاء بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ آپ نے اس کی ماں کے زندہ ہونے کا کیوں پوچھا تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ((إِنِّي لَا أَعْلَمُ عَمَلًا أَقْرَبَ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ بِرِّ الْوَالِدَةِ)) [الأدب المفرد: ٤] "میں والدہ کے ساتھ نیکی کرنے سے زیادہ اللہ کے قریب کرنے والا کوئی عمل نہیں جانتا۔"

آج والدین ذرا سی بات پر ناراض ہو کر بد دعائیں دینا شروع کر دیتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی دعا اللہ کے ہاں کس قدر مقبول ہے، لہٰذا ہر ممکن طریقہ سے اپنی اولادوں کے لیے دعا اور استغفار کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے، تاکہ والدین کی دعاؤں سے اولاد ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے اور اولاد کو بھی چاہیے کہ وہ والدین کی خدمت کرے اور دعائیں لے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۝۹۹

پس جب وہ یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ مصر میں داخل ہو جاؤ، اگر اللہ نے چاہا تو امن کے ساتھ رہو گے ۹۹

آیت 99 ﴿فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ . . . .﴾: یعقوب علیہ السلام اپنے اہل خانہ کے ہمراہ کنعان سے مصر پہنچے تو معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے مصاحبین کے ہمراہ شہر سے باہر نکل کر والدین اور دوسرے اہل خانہ کا شان دار استقبال کیا۔ آیت کے الفاظ "ادْخُلُوْا مِصْرَ" (مصر میں داخل ہو جاؤ) سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام قافلے کے استقبال کے لیے شہر کے باہر موجود تھے۔ مفسرین نے یعقوب علیہ السلام اور اہل خانہ کے وہاں پہنچنے کے حوالے سے مختلف روایات بیان کی ہیں، لیکن جو بات واضح سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے خاندان کے دیگر افراد کو ٹھہرانے کے لیے الگ سے اچھی جگہ دی جبکہ والد اور والدہ دونوں کو اپنے ساتھ ٹھہرایا، جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا تھا کہ یوسف علیہ السلام نے باقی بھائیوں کو دوسرے خیموں میں ٹھہرایا جبکہ سب سے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے جگہ دی۔

والدین کو اپنے ساتھ ٹھہرانا زیادہ عزت افزائی والی بات ہے اور پھر یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر یقیناً بہت زیادہ تیاری کی ہو گی۔ "اَبَوَيْهِ" سے مراد ماں باپ ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ چھوٹے بھائی کی ولادت کے وقت وفات پا گئی تھیں اور یہ ان کی خالہ تھیں جن کے ساتھ بعد میں یعقوب علیہ السلام کا نکاح ہوا تھا۔ اس کے لیے دلیل کے طور پر اسرائیلی روایات پیش کی جاتی ہیں لیکن اہل علم کے ہاں ان کا اعتبار نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آزر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا باپ نہیں تھا، حالاں کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ﴾ [الأنعام: ٧٤] مذکورہ آیت میں ابراہیم علیہ السلام آزر کو اپنا باپ کہہ رہے ہیں۔ جب قرآن باپ کہہ رہا ہے تو اس کے برعکس روایات جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس آیت میں بھی اگر "اَبَوَيْهِ" کہا گیا ہے جو کہ ماں اور باپ دونوں کے لیے بولا جاتا ہے تو خالہ مراد لینے کی کیا ضرورت ہے۔

بعض مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جگہ جگہ اسرائیلی روایات کو نقل کیا ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان چیزوں کو پیش کرنے کی بجائے دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پورے قصہ میں امتِ محمد ﷺ کی رہنمائی، ہدایت، دعوت اور تربیت کے لیے کیا اسباق بیان کیے ہیں اور کن چیزوں کو نمایاں کیا ہے۔ محض دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس واقعہ سے متعلق جس قسم کی بے بنیاد باتیں پھیلائی جاتی اور بیان کی جاتی ہیں یہ درست نہیں ہے۔ یوسف علیہ السلام اپنے والدین

وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ
مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ

اور انھوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ سب ان کے لیے سجدے میں گر گئے اور انھوں نے کہا اے میرے ابا جان! یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا، یقیناً میرے رب نے اسے سچا کر دکھایا اور یقیناً اس نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا، جب مجھے جیل سے نکالا اور اس وقت بھی جب وہ آپ سب کو دیہات

اور خاندان کے دیگر لوگوں کو مصر میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں تو ساتھ ہی کہتے ہیں: ﴿اٰمِنِیْنَ﴾ یعنی یہاں آپ کو بھوک، قحط اور دشمن کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہو گا اور آپ یہاں نہایت امن وسکون سے رہیں گے، البتہ یہ امن میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿اِنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ کہ اگر اللہ نے چاہا تو امن میں رہیں گے۔

آیت 100 ﴿وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾: یعقوب علیہ السلام اور خاندان کے دیگر افراد بھرپور استقبال کے بعد جب مصر پہنچ گئے اور وہاں مجلس سجی تو یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر اونچی اور نمایاں جگہ پر بٹھایا جو کہ یقیناً ان کا حق تھا جبکہ باقی سب نیچے بیٹھ گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجلس میں یہ چیز جائز ہے کہ جس کا احترام زیادہ کرنا ہو اس کی کرسی اونچی ہوسکتی ہے، یا اسے اونچی جگہ پر بٹھانے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ یہ غلط نہیں ہے۔ بعض صوفیاء اگرچہ ان چیزوں کو نہیں مانتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا جواز رکھا ہے۔ یوسف علیہ السلام ایک نبی کی حیثیت سے ماں باپ کا استقبال کر رہے ہیں اور انھیں اونچا درجہ دے رہے ہیں۔ والدین کا حق یقیناً بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اولاد پر فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو عزت و احترام سے نوازے۔ لیکن اپنے ایمان کی حفاظت اور عجب، خود پسندی اور ریا کاری سے بچنے کے لیے اس طرح نمایاں جگہ پر بیٹھنے سے پرہیز کرنا چاہیے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ((اِتَّقُوْا هٰذِهِ الْمَذَابِحَ)) [المعجم الكبير للطبراني: ۱۳/ ۵۴۰، ح: ۱۴۴۳۳] ''ان مذابح سے بچو۔'' امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے ''مذابح'' سے مراد صدور المجالس لیا ہے، یعنی صدارتی کرسی۔ مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو مجالس کی صدارتی جگہوں سے بچاؤ اور اس کام کے لیے کوشش مت کرو۔ ہاں اگر کسی کو عزت کی وجہ سے بٹھا دیا جائے تو وہ الگ بات ہے البتہ کسی کے دل میں اس کی خواہش نہیں ہونی چاہیے۔

﴿وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾: ماں باپ اور بھائیوں سمیت مجلس میں موجود سب لوگوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا جو کہ پہلی شریعتوں میں جائز تھا اور بادشاہوں وغیرہ کے لیے اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو یہ بھی سجدہ تعظیمی تھا۔ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سجدہ تعظیمی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جبکہ عبادت کا سجدہ تو کبھی بھی

بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ

سے لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان اختلاف کھڑا کر دیا تھا، بے شک میرا رب

غیر اللہ کے لیے روا اور جائز نہیں رہا۔ عبادت کا سجدہ صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ شریعت رب تعالیٰ کے حکم کا نام ہے، جب وہ ذات باری تعالیٰ خود کسی کو سجدہ کرنے کا کہہ دے تو پھر اس حکم کو پورا کرنا عبادت ہے۔ ایسی صورتِ حال میں عبادت اللہ کی ہو گی اور تعظیم اس شخص کی ہو گی، لیکن یہ چیز پہلی امتوں کے لیے تھی۔ اب اگر کوئی سجدہ تعظیمی کے لیے کہے تو اس کی بات پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ بعض لوگوں نے اس حوالے سے تاویل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ سجدہ وہ نہیں تھا جو نماز کے اندر کیا جاتا ہے اور جس میں انسان اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے بلکہ یہ سجدہ اس قسم کا تھا کہ سب نے یوسف علیہ السلام کو جھک کر سلام کیا تھا، جیسا کہ آج کل ہمارے معاشروں میں بھی جھک کر سلام کرنے کا طریقہ رائج ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ اس چیز کو بالکل بھی قبول نہیں کرتے۔

آیت میں صاف کہا گیا ہے: ﴿ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ﴾ ''وہ سب ان کے لیے سجدے میں گر گئے۔'' جب بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ تعظیمی کو پہلی امتوں کے لیے جائز رکھا تھا تو اس میں پریشانی کا اظہار کرنے اور تاویل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اس امت کا اعزاز ہے کہ اس میں تعظیمی سجدہ بھی جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید کا انداز بہت سادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا: ﴿ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ﴾ [البقرۃ: ۳٤] ''آدم کو سجدہ کرو۔'' اب اس کی یہاں یہ تاویل کی جائے کہ فرشتوں نے جھک کر سلام کیا تھا تو یہ انتہائی غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ تاویلیں کرنے سے نقصانات ہی ہوتے ہیں۔

وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ . . .: جب سارے سجدے میں گر پڑے تو یوسف علیہ السلام اپنے باپ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے اے ابا جان! یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے آپ کو بتایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میرا خواب سچا ثابت کر دیا۔ میں نے یہی کچھ خواب میں دیکھا اور آپ کو بتایا تھا۔ ثابت ہوا کہ خواب پورا ہوتے ہوئے دسیوں سال بھی لگ سکتے ہیں۔

وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ . . .: یوسف علیہ السلام اللہ رب العزت کی طرف سے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنی قید کا ذکر کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے ابا جان! مجھے میرے رب نے قید خانے سے نکالا۔ مصر کی عورتوں نے میرے خلاف سازش کی، عزیزِ مصر کی بیوی خاص طور پر اس معاملے میں پیش پیش تھی اور دوسرے سارے بھی مجھے قید کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کے ساتھ مجھ پر احسان کیا

لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

باریک بینی سے جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ بے شک وہی خوب جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿100﴾

اور مجھے رہائی دلوائی۔ اگر رب تعالیٰ نہ چاہتے تو میں کسی صورت رہا نہیں ہوسکتا تھا۔ اللہ رب العالمین نے دوسرا احسان مجھ پر یہ کیا کہ آپ کو فلسطین سے مصر میں میرے پاس لے آیا۔ میں نے آپ کو یہاں عزت، وقار اور قدر و منزلت سے نوازا ہے تو یہ آپ کا حق ہے اور یہ سب کچھ رب تعالیٰ کے فضل و کرم کی وجہ سے ہے۔

یہاں ایک بہت خوب صورت نکتہ بیان ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام یہ بات کہہ سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ مجھے کنویں سے نکالا، یعنی وہ اپنی بات کا آغاز یہاں سے کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ بھی تو رب تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا لیکن وہ سب سے پہلے قید خانے سے نکلنے کی بات کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ بھائیوں کے سامنے کنویں سے نکالے جانے کی بات کرتے تو لازمی طور پر بھائی شرمندہ ہوتے، لہٰذا خوشی کے اس موقع پر انھوں نے والدین اور بھائیوں کے سامنے یہ بات نہیں کی اور انھیں شرمندگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یوسف علیہ السلام اللہ رب العالمین کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ آپ کا فلسطین سے مصر آنا میرا یا میری حکومت کا کمال نہیں ہے اور نہ ہی میری طرف سے قحط کے دوران غلہ بھیجنے سے یہ سب کچھ ہوا ہے بلکہ یہ سب اللہ کا احسان ہے۔ یوسف علیہ السلام کی طرف سے بولے گئے ایک ایک جملے میں بہت بڑی دعوت اور تربیت ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ: یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ اے ابا جان! میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جو معاملہ پیش آیا اس میں ساری شرارت شیطان کی تھی۔ ظاہر ہے یہ معاملہ والدین اور بھائیوں کے ذہن میں بھی تھا لیکن یوسف علیہ السلام شیطان کی بات کر کے بھائیوں کا دفاع کر رہے ہیں اور ان کی عزتِ نفس کا پورا خیال رکھ رہے ہیں۔ مسلمان گناہ گار ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سود کی ستر قسمیں ہیں، ان میں سے سب سے کم تر سود کا گناہ اتنا ہے جیسا کہ ایک شخص اپنی والدہ کے ساتھ بدکاری کرے اور یقیناً سب سے بڑا سود اور زیادتی کسی مسلمان کی عزت کے بارے میں زبان درازی کرنا ہے۔ [المعجم الأوسط للطبراني: ۷/ ۱۵۸، ح: ۷۱۵۱۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۱۸۷۱] حقیقت ہے کہ امت کے لوگوں کی اگر اس انداز میں تربیت ہو جائے تو انھیں درپیش بہت سارے مسائل حل ہو جائیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ غصے پر ضبط اور کنٹرول کرنے کا یہ رویہ اختیار ہی نہیں کیا جاتا اور ذرا سی بات پر لوگ انتقام اور بدلہ لینے پر اتر آتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کا رویہ یہ تھا کہ انھوں نے بھائیوں کو قصوروار نہیں ٹھہرایا بلکہ شیطان کی طرف نسبت کر کے ان کی صفائی

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ

اے میرے رب! بے شک تو نے مجھے حکومت عطا کی اور مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی، اے آسمانوں اور زمین کے

پیش کر رہے ہیں۔ اس سے لگتا ہے یوسف علیہ السلام کے دل میں ہو گا کہ ابا جان بھائیوں سے ناراض ہوں گے کہ تم نے ہی یہ سارا ظلم کیا ہے، اس لیے وہ ان کا غصہ ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ باپ اپنے بیٹوں سے ناراض نہ ہو۔ جن لوگوں نے دعوتِ دین کا کام کرنا ہو ان میں اتنا حوصلہ ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو پھر اللہ تعالیٰ بلند مقام عطا کر دے تو اس سے دعوت کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ . . . : ''بے شک میرا رب باریک بینی سے جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے اتنی خوب صورت اور شان دار تدبیر کی کہ شیطان کے سارے منصوبے ناکام بنا کر مجھے اس مقام سے نواز دیا کہ آپ سب کو میرے پاس لے آیا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴾ ''بے شک وہی خوب جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

آیت 101 ﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ : یوسف علیہ السلام اللہ کی نعمتوں اور اس کے انعامات کا ذکر کر کے شکر کے کلمات ادا کر رہے ہیں اور دعائیں کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جب رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت ملے تو انسان کو اس کا تذکرہ کرنا چاہیے اور ساتھ ہی اپنے خالق اور مالک کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے۔ یوسف علیہ السلام یہی کہہ رہے ہیں کہ اے میرے رب! تو نے مجھے ملک عطا فرمایا۔ ''مِنَ الْمُلْكِ'' میں ''مِنْ'' کا لفظ بعض کے معنی میں ہے کہ ملک کا کچھ حصہ۔ ظاہر ہے مصر ایک خطے اور علاقے کا نام ہے، اصل بادشاہی تو اللہ رب العالمین کی ہے۔ ہر چیز اسی کے قبضے میں ہے۔ انسان کے پاس ہمیشہ تھوڑی چیز ہوتی ہے، اسی لیے یوسف علیہ السلام ''مِنَ الْمُلْكِ'' کہہ کر اس بات کو واضح کر رہے ہیں کہ اے اللہ! حقیقی بادشاہی تیری ہی ہے، مجھے تو تُو نے ملک اور حکومت کا حصہ عطا کیا ہے، لیکن اسے میں تیرا بہت بڑا انعام سمجھتا ہوں۔

وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ : اے اللہ! تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم سکھایا ہے، یہ تیرا بہت بڑا انعام ہے۔ اس آیت میں دو نعمتوں، ایک ملک کا ملنا اور دوسرے علم کے ملنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے کسی کو حکومت عطا فرما دے اور وہ وسائل کا صحیح استعمال کر کے دنیا کو فائدہ پہنچائے تو یہ اس ذات باری تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اس لیے اگر دنیا میں کسی جگہ مسلمانوں کی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو سمجھ لیں کہ رب تعالیٰ نے وہاں کے لوگوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ حکومت کی طرح علم کی بھی بہت اہمیت ہے۔ یوسف علیہ السلام اسی کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے یہ حکومت عطا فرمائی، ایسے ہی مجھے علم بھی عطا فرمایا ہے۔

وَ الْاَرْضِ ۖ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ

پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے، مجھے فرماں بردار بنا کر فوت کر اور مجھے نیک لوگوں

علم کی فضیلت بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر جو فضیلت اور برتری دی اس کی بنیاد علم ہی ہے، فرمایا: ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ [البقرة: ۳۱] ''(اللہ نے) آدم (علیہ السلام) کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔'' اس کا مطلب ہے کہ علم انسان کی فضیلت میں بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ ''مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ'' کے دو معنی کیے گئے ہیں: ایک یہ ہے کہ جو باتیں سامنے آئیں ان کو سمجھنے میں بڑا تیز فہم ہو، یا ان باتوں سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں کمال بصیرت رکھتا ہو۔ اس لیے یوسف علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ تو نے مجھے یہ نبوت کا علم عطا فرمایا جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہوتا، یا پھر اس کا مطلب خوابوں کی تعبیر کا علم ہے۔ دونوں تفسیریں اس سے مراد ہو سکتی ہیں۔ ''مِنْ'' کا مطلب یہی ہے کہ ضروری نہیں سارا علم اس میں آ گیا ہے بلکہ علم میں سے کچھ حصہ مجھے ملا ہے۔ جس طرح پیچھے یہ بات بیان ہوئی ہے کہ مجھے ملک میں سے کچھ حصہ دیا گیا، ایسے ہی علم میں سے کچھ حصہ عطا کیا گیا ہے۔ حقیقی علم تو اللہ رب العالمین کے پاس ہی ہے۔ وہ جسے جتنا چاہتا ہے اتنا علم عطا کر دیتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے بھی یہ بات نہیں کی کہ اے اللہ! تو نے مجھے سارا علم دے دیا ہے بلکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ جتنا علم تو نے مجھے دیا ہے اسے میں تیرا انعام سمجھ کر تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۖ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ: ''اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے۔'' میں خوابوں کی تعبیر بیان کر رہا ہوں، خزانے کا نظام سنبھال رہا ہوں، یا ملک کے دیگر معاملات چلا رہا ہوں تو اس میں تو ہی میرا ساتھی اور میرا کارساز ہے۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تیری مدد کے ساتھ ہی کر رہا ہوں۔ گویا انسان کے دل میں کبھی بھی تکبر نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیشہ عاجزی اور انکساری کا رویہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ: ''مجھے فرماں بردار بنا کر فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔'' اے اللہ! دنیا میں تو نے حکومت عطا کر دی، علم کی نعمت سے نواز دیا اور دوسری بہت ساری چیزیں دے دیں، اب میری ساری توجہ اپنی آخرت کی طرف ہے۔ حقیقت ہے کہ ہر ایمان والے کو اسی بات کی فکر ہونی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت کی یہی رہنمائی کی اور اس حوالے سے یہ دعا سکھائی ہے: ((إِذَا أَرَدْتَ فِتْنَةً فِي قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ)) [سنن الترمذي، أبواب تفسير القرآن، باب ومن سورة ص: ۳۲۳۵] ''جب تو کسی قوم کو آزمائش میں

بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

کے ساتھ ملا دے ﴿101﴾

ڈالنا چاہے تو مجھے آزمائش میں ڈالے بغیر موت دے دے۔'' اقتدار اور حکومتیں انسانوں کو اس سوچ وفکر سے بہت دور لے جاتی ہیں، بہت سارے لوگوں کے ذہن برباد ہو جاتے ہیں، وہ تکبر کرنے لگتے ہیں اور عیاشیوں میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب پر ہمارا حکم چلتا ہے اور سارے ہمارے تابع ہیں۔ عام طور پر حکومتوں میں موجود زیادہ تر لوگوں کا حال یہی ہوتا ہے، لیکن یوسف علیہ السلام اللہ سے ڈر رہے ہیں اور دعائیں کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اسلام اور فرماں برداری کی حالت میں موت دینا اور تیرے وہ پسندیدہ لوگ جنھیں تو نے جنت عطا کرنی ہے میرا حشر ان لوگوں کے ساتھ کرنا۔ یہ دعا بہت بڑی دعوت ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں علم اور حکومت کی نعمت سے نوازے اور عزت، فضیلت اور مقام و مرتبہ عطا فرمائے انھیں خاص طور پر یہ دعا ضرور کرنی چاہیے۔

عقل مند بندہ وہ ہے جو دنیا کی نعمتوں میں گم نہ ہو۔ یوں تو سبھی لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں آخرت یاد ہے لیکن یہ آیت بتا رہی ہے کہ آخرت کو حقیقت میں وہی یاد رکھتا ہے جو موت کو یاد کرتا ہے۔ ایمان والوں کی ہمیشہ یہ دعا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم پکے مسلمان ہوں اور دنیا میں ہمارے ذمے جو کام ہیں انھیں بخوبی انجام دینے کے بعد یہاں سے رخصت ہوں۔ کوئی کام ہم سے رہ نہ جائے اور ہماری اطاعت اور فرماں برداری میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہے۔ اللہ رب العالمین فرماتے ہیں: ﴿مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء: ٦٩] ''جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ (آخرت میں) ان لوگوں کے رفیق ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، وہ (انعام یافتہ) انبیاء ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء ہیں اور نیک لوگ ہیں اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔'' یہ آیت بہت بڑی دعوت ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ علم کی دولت، حکومت اور وسائل سے نوازے ان کی ذمہ داریاں یقیناً زیادہ ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کو اپنی آخرت کی فکر بھی زیادہ ہونی چاہیے اور انھیں دعائیں بھی بہت کرنی چاہییں کہ یا اللہ! ہمیں فرماں بردار رکھنا اور حشر میں انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور شہداء کا ساتھ نصیب فرمانا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں آپ کو گلے کی سخت تکلیف ہوگئی تو میں نے آپ سے سنا آپ فرما رہے تھے: ((مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ)) [صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب: ﴿فأولئك مع الذين...﴾: ٤٥٨٦] ''(مجھے) ان لوگوں کے ساتھ (ملنا ہے) جن پر اللہ نے انعام کیا، وہ (انعام یافتہ) انبیاء ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء ہیں اور نیک لوگ ہیں۔''

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے فیصلے پر متفق ہوئے تھے اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے ﴿102﴾

آیت 102 ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ: یوسف علیہ السلام کے قصہ کا اختتام ہو رہا ہے۔ سورت کے آخر تک اس واقعہ سے جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو دعوت پیش کرنا چاہتے ہیں اب اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس آیت میں ایک مرتبہ پھر یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ رب تعالیٰ نے یہ سارا واقعہ آپ کو وحی کے ذریعے بتایا ہے۔ اس سے پہلے آپ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ "وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ" اور نہ ہی آپ ان کے پاس موجود تھے۔ آپ نے یہ واقعہ کہیں سے پڑھا بھی نہیں ہے۔ سچی اور صحیح بات وہی ہے جو اللہ رب العالمین کی طرف سے اپنے نبی کو بتائی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے طور پر اس واقعہ کے حوالے سے جتنی باتیں بنائی ہوئی ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے کہ اصل علم وحی کا علم ہے اور اتباع اسی کی ہے۔ وحی کے ذریعے جو باتیں بیان نہیں کی گئیں انھیں تسلیم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی انھیں شریعت سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں نبی ﷺ کی نبوت و صداقت پر ناقابلِ تردید دلائل پیش کیے ہیں اور اہلِ مکہ کو خبردار کیا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ اگر آپ سچے پیغمبر نہ ہوتے تو ہزاروں سال پہلے کے واقعات آپ کو کیسے معلوم ہو سکتے تھے اور پھر یہ واقعات وہ تمھارے سامنے کس طرح بیان کر سکتے تھے۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ: "اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے فیصلے پر متفق ہوئے تھے اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے۔" یعنی جب برادرانِ یوسف نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ یوسف (علیہ السلام) کو کنویں میں پھینک دیا جائے اور وہ اپنے باپ سے جا کر کیا باتیں کر رہے تھے، اے نبی! آپ کو اس بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت آپ وہاں تھے۔ یہ باتیں آپ کو اب بتائی جا رہی ہیں۔ یہ ساری باتیں اہل مکہ کے لیے، یا ان سارے لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے نہیں تھے، بہت بڑی دعوت ہیں کہ محمد ﷺ تمھارے سامنے پلے بڑھے ہیں، ان کا کوئی استاد نہیں اور نہ ہی آپ کسی سے پڑھے ہیں، لیکن اس کے باوجود سارا واقعہ انھوں نے تفصیل کے ساتھ تمھارے سامنے بیان کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ساری باتیں آپ ﷺ تک وحی کے ذریعے پہنچائی گئی ہیں، لہٰذا اب تمھیں بھی نبی ﷺ کی دعوت پر ایمان لے آنا چاہیے اور آپ پر نازل کردہ علم کو قبول کر لینا چاہیے۔ یہ

وَمَآ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۰۳﴾

اور آپ خواہ کتنا ہی چاہیں، ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ﴿103﴾

دعوت اس دور میں اہل مکہ کے لیے تھی جبکہ آج ساری دنیا کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ آپ ﷺ کے ساتھ قائم کیا تھا، جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دین مکمل ہو چکا ہے، اب سب کے لیے دعوت یہی ہے کہ وہ اس دین کو سچے دل سے تسلیم کریں۔ اسی میں ان کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

آیت 103 **وَمَآ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ:** اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ تو اس بات پر بہت حریص ہیں کہ سبھی لوگ ایمان لے آئیں لیکن آپ کتنا بھی چاہیں یہ سارے لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، اس لیے آپ فکرمند اور پریشان نہ ہوں۔ ہم نے یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ وحی کے ذریعے سے آپ تک پہنچا دیا، آپ نے بھی اسے اسی طرح لوگوں کے سامنے بیان کر دیا۔ اب چاہیے تو یہ کہ وہ اس پر ایمان لائیں، لیکن تھوڑے لوگ ہوں گے جو ان باتوں کو تسلیم کریں گے۔ اکثر لوگ وہی ہیں جو انکار کے لیے کوئی اور چیز گھڑ کر لے آئیں گے۔ نبی اکرم ﷺ یقیناً اس بات پر بہت غم زدہ ہوئے کہ مشرکین مکہ سارے دلائل سننے کے بعد بھی دین کی دعوت قبول نہیں کر رہے۔ سابقہ قوموں کا حال بھی یہی رہا کہ ان کے اکثر لوگ ماننے والے نہیں تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی دعوتِ دین کے لیے محنتوں و کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے حوصلہ دے رہے ہیں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن جن کی قسمت میں ایمان لانا نہ ہو وہ کبھی حق کی دعوت قبول نہیں کریں گے۔

یہاں سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ داعی حضرات کو دیکھنا چاہیے کہ میں نے لوگوں کی اصلاح کرنے، سمجھانے اور دعوت پیش کرنے میں کسی کمزوری کا مظاہرہ تو نہیں کیا اور دعوت پیش کرنے کے لیے میرے پاس جو وسائل ہیں انھیں میں پوری طرح استعمال کر رہا ہوں یا نہیں۔ ماننا یا نہ ماننا اور نتیجہ تو اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کے لیے کامیابی اور ناکامی کا معیار یہ نہیں ہے کہ کس کے ساتھ لوگ کتنے زیادہ ہیں، کون سی جماعت کے پاس طاقت زیادہ ہے اور پذیرائی کسے زیادہ مل رہی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ وحی کے ذریعے نازل ہونے والے دین کی دعوت پر قائم ہیں یا نہیں۔ حق وہی ہے جو آسمانوں سے وحی کے صورت میں آیا ہے۔ داعی کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس کی پیش کردہ دعوت کے طریقے میں کوئی کمزوری ہے تو اس کی اصلاح کی جائے۔ جہاں تک ہدایت ملنے یا نہ ملنے کی بات ہے تو یہ اللہ کے قبضے میں ہے۔ کتنے لوگ مانیں گے اور کتنے انکار کریں گے، اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اکثریت ہمیشہ انکار کرنے اور مخالفت کرنے والوں کی رہی ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے نبیوں کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ نبی ﷺ کے ابتدائی دور میں بھی یہی کیفیت تھی لیکن پھر نبی اکرم ﷺ کے آخری دور میں ایسا ہوا کہ

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع ۱۱ ۵

حالانکہ آپ ان سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتے، یہ تو صرف تمام جہانوں کے لیے ایک بڑی نصیحت ہے ﴿104﴾

﴿يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾ [النصر: ۲] لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے، رب تعالیٰ چاہیں گے تو اب بھی ایسا ہو جائے گا۔ دعوت کے ساتھ ساتھ جہاد ہو گا تو اللہ تعالیٰ زیادہ راستے کھولے گا، توفیق سے نوازے گا اور لوگ دین کی طرف آئیں گے۔

داعی حضرات کی کوشش ہمیشہ یہی ہونی چاہیے کہ انھیں کام کرنے کے مواقع زیادہ ملیں، دشمنانِ اسلام دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے جو تدبیریں کر رہے ہیں انھیں ناکام بنایا جائے اور دعوت کے راستے بند نہ ہونے دیے جائیں۔ آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ دشمن قوتیں اسلام کی راہ روکنے کے لیے کبھی دھمکی آمیز رویے اختیار کرتی ہیں تو کبھی بین الاقوامی سطح پر قانون سازیاں کی جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ کتاب وسنت پر باہم متحد ہوں، ان کے آپس میں رابطے مضبوط ہوں اور اللہ تعالیٰ انھیں کام کرنے کے مواقع عطا فرمائے۔ سیاست کے میدان میں بھی سوچ یہی ہونی چاہیے کہ دعوت اور خدمت کے کام کو کس طریقے سے زیادہ سے زیادہ بہتر بنانا ہے اور دین کی دعوت کس طرح مزید مضبوط ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ لے کر آپ آگے بڑھیں گے تو رب تعالیٰ کی تائید حاصل ہو گی اور اللہ کے فضل وکرم سے آپ کا کام بھی بہتر ہوتا جائے گا۔

یہ مسلم معاشروں میں کرنے والے کام کی بات ہو رہی ہے، جہاں تک کافر قوتوں کا معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ جب مسلمانوں کو قوت عطا کرتا ہے تو ان میں سے بھی بہت سارے لوگ دعوت تسلیم کرنے لگتے ہیں۔ تبوک میں رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی دی تو شام کے ساتھ جتنی صلیبی ریاستیں تھیں سب نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اعلان کیا کہ ہم مدینہ کے تابع ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس موقع پر انھیں ایک تحریر لکھ کر دی، جس میں ان کے لیے امان لکھ دی۔ [دیکھیے دلائل النبوة للبيهقي: ۵/ ۲۴۷، ۲۴۸] جزیہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اسلام کی برتری کو قبول کر لیا ہے۔ اس چیز سے مسلمانوں کو دعوت کے رستے ملتے ہیں اور جہاد کی راہ میں کھڑی کی گئی رکاوٹیں دور ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی سیاست کا ایک بہت بڑا مقصد دین کی دعوت کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانا ہے۔

آیت 104 ﴿وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ:﴾ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ کوئی بات کر رہے ہیں تو اس میں آپ کا اپنا مفاد ہوتا ہے لیکن اللہ رب العزت فرما رہے ہیں کہ اے نبی! آپ تو ان سے کسی قسم کی کوئی اجرت نہیں مانگتے اور آپ کو ان سے کسی قسم کا کوئی مفاد نہیں ہے۔ آپ تو صرف دین کی دعوت پیش کر کے ان کی آخرت سنوارنا چاہتے ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں اور وہ ان پر توجہ ہی نہیں کرتے ﴿105﴾

بعض لوگ نہ ماننے کے لیے ان چیزوں کو بھی بہانہ بناتے ہیں کہ فلاں شخص کا چونکہ اپنا مفاد ہے، اس لیے وہ یہ بات کر رہا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے انکار کرنے والوں کے لیے کسی بہانے کی گنجائش ہی ختم کر دی ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ: یہ تو نصیحت ہے، جو مانے گا اس کا فائدہ ہے اور جو نہیں مانے گا اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔ ہمارا کام تو سب تک دعوت پہنچا دینا ہے۔ "لِلْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب ہے کہ یہ دعوت اور نصیحت صرف مکہ والوں کے لیے ہی نہیں قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ دینِ اسلام کی یہ دعوت تمام براعظموں تک پھیلنے والی ہے۔ جو لوگ نہیں مانتے نہ مانیں، ان کے نہ ماننے سے دین کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دیتے ہوئے استقامت کا درس دے رہے ہیں۔ سب مسلمانوں کے لیے یہی دعوت ہے اور اسی پر ان کی تربیت ہونی چاہیے۔

آیت 105 ﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ . . . .: اس آیت میں بھی اللہ رب العالمین نے اپنے نبی کو تسلی دی ہے کہ اگر سارا واقعہ سن کر بھی یہ لوگ آپ کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے تو پریشان نہ ہوں، یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ خالقِ کائنات کی بے شمار نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے۔ سورج ہر روز مشرق سے طلوع ہوتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ کائنات اور افلاک کا سارا نظام صحیح چل رہا ہے، دن ہو یا رات کسی کام میں کوئی تاخیر نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں اللہ رب العالمین کی بہت بڑی نشانیاں ہیں، لیکن انھیں دیکھ کر بھی وہ کوئی سبق اور نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ جن لوگوں کو رب تعالیٰ کی اتنی بڑی نشانیاں دیکھ کر بھی توحید کی سمجھ نہیں آتی، وہ یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ سن کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کی قسمت میں انکار کرنا ہی ہے۔

اللہ رب العزت نے آسمانوں و زمین کی نشانیوں کا ذکر کیا تو فرمایا: ﴿ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾ [الملك: ٤] "پھر بار بار دیکھو، تمھاری نگاہ ناکام ہو کر تمھاری طرف پلٹ آئے گی، اس حال میں کہ وہ بہت تھکی ہو گی۔" مطلب یہ کہ آپ آسمانوں و زمین اور پہاڑوں کی طرف نظر دوڑا کر دیکھیں، آپ کو کائنات کے پورے نظام میں کسی جگہ کوئی نقص اور خرابی نظر نہیں آئے گی، لیکن یہ ساری چیزیں ان لوگوں کے لیے ہیں جن کے پاس سمجھنے والی عقل، صحیح عقیدہ اور منہج موجود ہے اور جو حقائق کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو اس دعوت سے الگ رکھا ہے، ان کے متعلق اللہ رب العالمین فرماتے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٧٩] "یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں، یہی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔" ان لوگوں کی بھی آنکھیں، دل اور کان ہیں لیکن ان کی غفلتوں نے انھیں اس

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

اور ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان لانے کے باوجود شرک کرنے والے ہوتے ہیں ﴿106﴾

مقام پر پہنچا دیا ہے کہ وہ ہدایت اور شریعت سے یکسر غافل ہوتے ہیں۔ انھیں پتا ہی نہیں کہ انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہی بات سمجھائی ہے کہ بہت سارے لوگ یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو ایک قصہ ہی سمجھیں گے لیکن جن لوگوں کو رب تعالیٰ نے حکمت، صلاحیت اور ایمان کی نعمت سے نوازا ہے وہ اسے پڑھیں گے تو اس سے بہت کچھ حاصل کریں گے اور انھیں دنیا میں کام کرنے کا بہت زیادہ موقع ملے گا۔

آیت 106 وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ: یہ بہت تکلیف دہ بات ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے بعد شرک کا ارتکاب کیا جائے۔ مشرکینِ مکہ کا وطیرہ تھا کہ وہ اللہ کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بتوں کی پوجا اور شرک کرتے تھے۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار بھی اللہ کو مانتے اور صلیب کی پوجا کرتے تھے جبکہ یہودیوں کی حالت بھی یہی تھی کہ عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے اور شرک کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ قوموں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے نبی کو تسلی دے رہے ہیں کہ ایسے لوگ بھی آپ کو ملیں گے جو رب تعالیٰ کو ماننے کے باوجود شرک کرتے ہیں۔ اس وقت بھی ساری دنیا میں صورتِ حال یہی ہے۔ ہندوؤں میں رام کا تصور موجود ہے، بودھ بھی خدا کا تصور رکھتے ہیں اور عیسائی بھی اللہ کو مانتے ہیں، لیکن تین میں سے ایک مانتے ہیں۔ جب یہ سارے لوگ شرک کرتے ہیں تو امتِ محمد ﷺ کو چاہیے کہ توحید کی وہ دعوت جو نبی اکرم ﷺ سمجھا کر گئے ہیں، اس دعوت پر لوگوں کو مضبوط کیا جائے، لیکن افسوس کہ آج مسلمان اللہ، اس کے رسول ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے کے بعد بھی شرک کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدے کی ان کمزوریوں میں مبتلا ہونا دعوت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

امتِ محمد ﷺ کے لیے کسی صورت گنجائش نہیں ہے کہ وہ شرکیہ عقائد میں مبتلا ہو۔ مسلمانوں کے پاس اللہ کا قرآن اسی حالت میں موجود ہے جس میں نازل ہوا تھا۔ یہ اس امت کے پاس بہت بڑا سرمایہ ہے۔ نبی ﷺ نے قرآن کے علاوہ نازل ہونے والی وحی کو بھی بیان کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ اس کی بھی حفاظت کی ہے۔ اس سارے دین کی موجودگی میں پھر غیر اللہ کی پوجا پاٹ اور ذات و صفات میں شرکیہ معاملات کا ہونا بہت افسوس کی بات ہے۔ گویا اللہ رب العالمین نے یہ بات سمجھائی ہے کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ اللہ کو مان کر بھی لوگ شرک کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ امتِ محمد ﷺ میں بھی بعض لوگ اللہ رب العزت پر ایمان لانے کے بعد شرک کرتے رہیں گے۔

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

تو کیا وہ بے خوف ہو گئے ہیں اس بات سے کہ اللہ کا عذاب انھیں ڈھانپ لے، یا ان پر اچانک قیامت آجائے جبکہ ان کو احساس ہی نہ ہو ﴿107﴾

یہاں ایک اہم بات سمجھنے والی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کا ذکر بھی کیا ہے اور شرک کا بھی، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان رکھنے والے اگر شرکیہ کام کا ارتکاب کریں تو ان سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی جب تک اس پر حجت قائم نہ ہو جائے۔ جب مسلمان بندہ گناہ گار ہوسکتا ہے تو اس سے صغیرہ کے ساتھ ساتھ کبیرہ گناہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ رکھا ہے کہ انھیں مومن تسلیم کرتے ہوئے ان کی جہالت و غلطیوں کی اصلاح کی جائے اور ان کے عقیدے درست کیے جائیں۔ گناہوں کی وجہ سے ایمان کا انکار کرنا درست نہیں ہے۔

یہ معتزلہ جیسے گمراہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ مسلمانوں کو بدعملی یا کبیرہ گناہ کی وجہ سے کافر و مشرک کہہ دیتے ہیں۔ آج کل فرقہ واریت کے اس دور میں یہ فتنہ بہت عام ہے، عقیدے کمزور ہیں، لوگ قرآن و حدیث پڑھتے نہیں، اوپر سے تعصب و ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں، تو اس ماحول میں کبیرہ گناہ اور شرکیہ و بدعتی اعمال کی وجہ سے لوگوں کو کافر کہہ دیا جاتا ہے اور کلمہ کا انکار کر دیا جاتا ہے۔ یہ بہت غلط رویہ ہے۔ کلمہ پڑھنے والوں کے کلمہ کا انکار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ انھیں مومن و مسلمان سمجھتے ہوئے ان کی اصلاح کرنی چاہیے۔ تکفیری اور فرقہ پرست لوگ ہمیشہ غلطیوں پر نظر رکھتے، انھیں اچھالتے اور فتوے لگاتے ہیں۔ خارجی اور اس قسم کے گمراہ فرقوں کا یہی وطیرہ تھا۔ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہی نہیں تھے، بس عملی کوتاہی کی بنیاد پر فتوی لگاتے اور نفرتیں پھیلاتے تھے۔ امت مسلمہ کا کام یہ ہے کہ اس غلط طریقے کو چھوڑ کر کلمے کو عزت دی جائے اور لوگوں کی ہمدردی کی بنیاد پر اصلاح کا فریضہ سرانجام دیا جائے۔

آیت 107 اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ : قوموں میں شرک، گمراہیاں اور انبیاء و کتابوں کے انکار جیسی چیزیں اس لیے ہوتی ہیں کہ لوگ بے خوف ہو جاتے ہیں اور انھیں اپنی غلطیوں کا احساس تک نہیں رہتا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے اللہ کی پکڑ آتی ہے۔ پہلی قوموں پر اسی شرک کی وجہ سے ہی عذاب آتے رہے، اس لیے بندوں کو کسی صورت یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اب ان پر کوئی عذاب یا پکڑ نہیں آئے گی۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ رب تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں جو ڈھانپ لینے والا ہے۔ "غَاشِيَةٌ" کا مطلب ہوتا ہے چھا جانا، ڈھانپ لینا، یعنی جو کسی کو ہلنے نہ دے اور حرکت نہ کرنے دے۔ اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو قیامت کے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ

کہہ دیجیے کہ یہی میری راہ ہے، میں اللہ کی طرف پوری بصیرت کے ساتھ دعوت دیتا ہوں، میں بھی اور وہ بھی جس نے

اسی خوفناک عذاب سے ڈرا رہے ہیں۔

اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: ''یا ان پر اچانک قیامت آجائے جبکہ ان کو احساس ہی نہ ہو۔''

یعنی اگر بالفرض تم پر اللہ کا عذاب نہیں آتا تو قیامت نے تو آنا ہی ہے۔ تمھیں اس سے کسی صورت بے خوف نہیں ہونا اور یہ نہیں سوچنا کہ اللہ کا عذاب اور اس کی پکڑ نہیں آئی تو اپنی گمراہی پر پکے ہو جاؤ۔ اس کا عذاب کسی وقت بھی آ سکتا ہے، البتہ اس عذاب کا طریقہ کیا ہو گا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اللہ رب العالمین فرماتے ہیں کہ قیامت یوں اچانک آ جائے گی کہ تمھیں پتا بھی نہیں چلے گا، اس لیے تمھیں چاہیے کہ اللہ کا حکم مانو اور اس کی اطاعت کرو۔

آیت 108 قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ: اللہ رب العالمین اپنے نبی کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ کہہ دیں کہ میری راہ اور میرا مشن یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ میں اپنے اس مشن سے کسی صورت پیچھے نہیں ہٹوں گا اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی کمزوری آنے دوں گا، بلکہ میرے ذمے جو کام لگایا گیا ہے اسے میں ہر صورت پورا کروں گا۔ نبی ﷺ کی مناسبت سے امتِ محمد ﷺ کے لیے بھی یہی پیغام ہے کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کے وارث بن کر اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔ گویا اس آیت میں پہلی بات یہ سمجھائی گئی ہے کہ داعی حضرات کا سب سے بڑا مشن دعوت الی اللہ ہے۔

دوسری بات جو اس میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دعوت ہمیشہ اللہ کی طرف دینی ہے۔ غیر اللہ کی طرف دعوت دینا کسی صورت جائز نہیں۔ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے بھی کتاب و سنت کی وہ دعوت پیش کرنی ہے جو رسول اللہ ﷺ پر وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے۔ جو کوئی خود اس دعوت کی پابندی کرتا ہے وہی صحیح معنوں میں دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے اور جو کوئی اس سے انحراف کرتا ہے اس کی دعوت یقیناً ناقص ہو گی۔ کسی ایک چیز کو نمایاں کر کے دوسری چیزوں کو غیر اہم بنا کر پیش کریں گے تو اس کا نقصان ہو گا۔ یعنی نہ تو شرکیہ اعمال کی دعوت دینی چاہیے اور نہ ہی دعوت ناقص ہو۔ کتاب و سنت کی بنیاد پر لوگوں کے سامنے دعوت پیش کر کے انھیں مسائل کا حل بتایا جائے۔

جب آپ کسی خاص چیز کی طرف دعوت دیں گے تو دعوت ناقص ہو جائے گی۔ ایسے ہی کسی شخص کی طرف بلائیں گے کہ سبھی لوگ فلاں شخصیت کے ساتھ جڑ جائیں تو اس سے بھی فرقے اور گروہ بنیں گے۔ ہمارے معاشروں میں الگ

وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

میری اتباع کی اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ﴿108﴾

الگ سلسلے، فرقے اور گروہ اسی چیز کا نتیجہ ہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی اور کو حق کا معیار قرار دے کر سمجھا جائے گا کہ جو کچھ یہ فرمادیں وہ حق ہے تو اس سے معاشروں میں بگاڑ اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ نبی کی طرف دعوت اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور اسے رب تعالیٰ نے خود مقرر کیا ہے۔ نبی کے علاوہ اللہ نے کسی کو اپنا نمائندہ مقرر نہیں کیا اور نہ ہی یہ کہا ہے کہ اس کی طرف سے کہی گئی ہر بات میری طرف سے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے نبی کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰] ''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔'' نبی کے علاوہ کسی شخص کی اطاعت اللہ کی اطاعت نہیں ہے۔ جب اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی اور کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو پھر اختلافات پروان چڑھتے ہیں۔ مسلمانوں میں پہلے بھی جتنا بگاڑ آیا ہے اسی طرح سے آیا ہے۔ لوگوں نے اپنے بڑوں اور بزرگوں کے دنیا سے جانے کے بعد ان کی تصویریں اور مورتیاں بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی۔ شرک اور گمراہیوں کی بنیاد ہمیشہ یہی چیزیں بنی ہیں، اس لیے دعوت صرف رب تعالیٰ کی طرف دی جانی چاہیے۔

عَلٰى بَصِيْرَةٍ: بصیرت اور حکمت کے جتنے الفاظ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے ان سے مراد وحی کے ذریعے نازل ہونے والا علم ہے۔ جب کتاب کے ساتھ حکمت کا لفظ آئے تو اس کا مطلب سنت ہوتا ہے اور اگر مطلق حکمت کا لفظ آئے تو مراد کتاب و سنت لیا جاتا ہے۔ مکمل وحی کا علم کتاب اور سنت دونوں چیزوں میں ہے۔ رسول وحی کی بصیرت کی روشنی میں دین کی دعوت کا کام کرتا ہے اور اس کے پیروکاروں کے لیے بھی طریقہ یہی ہے کہ وحی کی روشنی میں دین کی دعوت کا کام کریں۔ اللہ تعالیٰ حق کی بصیرت اسے دیتا ہے جو وحی کا پابند ہوتا ہے۔ جو کتاب و سنت کا پابند ہوتا ہے اسے رب تعالیٰ فہم اور صلاحیت دے دیتے ہیں۔ اس کا اجتہاد نہایت مضبوط، مدلل اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ دنیا میں الحاد اسی طریقے سے پھیلا ہے کہ کتاب و سنت سے رہنمائی لینے کی بجائے اپنی سمجھ کے مطابق مسائل حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ جدید دور کا اجتہاد ہے۔ اس سے دیکھ لیں کس قدر گمراہیاں پھیلی ہیں۔ کتاب و سنت کی بصیرت رکھنے والا صحیح عالم سمجھتا ہے کہ اجتہاد کے لیے میں نے اپنی عقل و فہم کی بجائے قرآن و حدیث سے اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

جس شخص کا عقیدہ مضبوط ہو، کتاب و سنت کے فہم میں غلطی اس سے بھی ہوسکتی ہے، اس لیے کسی ایک مجتہد کا اجتہاد دوسرے کے لیے دلیل نہیں ہوتا۔ صحیح اجتہاد کرنے والے کو دوہرا اجر مل جائے گا۔ اگر اجتہاد صحیح نہیں ہے پھر بھی

نیت خالص ہونے کا ایک اجر اسے مل جائے گا، کیوں کہ اس نے کتاب و سنت سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ)) [صحيح البخاري، كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب أجر الحاكم إذا اجتهد: ۷۳۵۲] ''جب حاکم اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے اور فیصلہ صحیح ہو تو اسے دہرا ثواب ملتا ہے اور جب کسی فیصلہ میں اجتہاد کرے اور غلطی کر جائے تو اسے (اجتہاد کا) اکہرا ثواب ملتا ہے۔'' کسی بھی شخص کے لیے دلیل کتاب و سنت ہی ہے۔ معاشروں میں مختلف گروہ اس طریقے سے پروان چڑھے کہ کسی عالم یا امام نے اجتہاد کی بنیاد پر کوئی فتویٰ دیا تو اب اس کے اجتہاد کو دلیل بنا کر دوسرے مفتی حضرات نے بھی وہی فتویٰ جاری کرنا شروع کر دیا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم ائمہ کرام کی بہت عزت و قدر کرتے ہیں لیکن پیش آنے والے مسئلہ میں کتاب و سنت سے اجتہاد کریں گے تو یہ نہ تو تقلید ہو گی اور نہ ہی اس سے گروہ اور فرقے بنیں گے۔ اس سے امت متحد رہے گی اور مسائل حل ہو جائیں گے۔ دعوت کے لیے بصیرت بنیادی چیز ہے اور اسی کے ذریعے سے دعوت صحیح فائدہ مند ہوتی ہے۔ دعوت کی مناسبت سے یہ تیسری اہم چیز ہے جسے ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ: ''میں بھی اور وہ بھی جس نے میری اتباع کی۔'' میرا منہج یہی ہے اور میری اتباع کرنے والوں کا منہج بھی یہی ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا کام کریں گے اور اسی بصیرت پر کریں گے جو رب تعالیٰ کی طرف سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ کتاب و سنت کی نبی والی حکمت ہی اللہ تعالیٰ نے امت کو عطا فرمائی ہے۔ علماء اس کے وارث ہیں اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کی دعوت کو حکمت کے ساتھ آگے پہنچائیں۔ جو کوئی اس منہج کو چھوڑتا ہے وہ حقیقت میں نبی کی اتباع نہیں کرتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہ کرنے کی وجہ سے امت میں بگاڑ اور فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے۔ امت تو ایک ہی ہے اور اسے ایک ہی ہونا چاہیے۔ امت امام سے ہے، یعنی ایک امام کے پیچھے جمع ہونے والے لوگ۔ امت کے امام نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظی معنی کے اعتبار سے امام پیشوا کو کہتے ہیں۔ جس عالم نے حدیث، تفسیر یا فقہ میں زیادہ کام کیا اس کے شاگردوں نے اسے اس فن میں امام کا درجہ دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کوئی فقہ کا امام ہے، کوئی حدیث کا اور کوئی تفسیر کا امام ہے، لیکن دین کے امام صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لیے یہ نہیں ہے کہ حدیث کے امام کو آپ دین کا امام مان لیں اور اس کی ہر بات کو دلیل بنا لیا جائے۔ یا فقہ یا تفسیر کے امام کو دین کا امام بنا کر اس کی تقلید شروع کر دیں۔

دلیل اور حجت صرف نبی کی بات ہے۔ اگر اس منہج کا صحیح ادراک ہو جائے اور اس پر محنت کی جائے تو امت پھر سے متحد ہو سکتی ہے اور باہمی اختلاف، فرقہ واریت اور گروہ بندیاں ختم ہو جائیں گی۔ معاشروں میں یہ تقسیم کہ فلاں مذہبی

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا

اور ہم نے آپ سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں سے کچھ مردوں کو رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے،

گروہ ہے اور فلاں سیاسی جماعت ہے، یہ تقسیم بھی نہیں ہونی چاہیے۔ جس طرح نکاح، طلاق اور دوسرے امور کی دلیل کتاب وسنت سے لی جائے گی، ایسے ہی سیاست ومعیشت اور معاشرت کے مسائل حل کرنے کے لیے بھی دین سے ہی رہنمائی لی جائے گی۔ قرآن وسنت سے بصیرت اور دلیل حاصل کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ معاشروں سے صرف تقلید، الحاد اور بے دینی ہی نہیں پارٹی بازی اور انتشار وافتراق کے سب سلسلے بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ نبی کی اتباع کا چاہے کوئی کتنا ہی دعویٰ کیوں نہ کرے اگر اس کا منہج نبی والا نہیں ہے تو اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کو مانتے ہیں، لیکن اس کے لیے کسی نے امام کو وسیلہ بنالیا تو کسی نے تصوف کے اندر باطنی شخصیات کی بات شروع کر دی۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک علم وہ ہے جو نبی ﷺ نے سب کو سکھا دیا، یہ شریعت کا علم ہے اور دوسرا علم طریقت کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو خاموشی سے یہ علم دے دیا تھا۔ ایسے ہی کچھ لوگ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی یہ بات کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے پوشیدہ حقائق سے انھیں آگاہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صوفیا اپنے سلسلے کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جوڑتے ہیں اور بعض اپنا سلسلہ علی رضی اللہ عنہ سے ملاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں امت میں انتشار برپا کرنے والی ہیں، جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو نبی ﷺ کی روایات بیان کرنے اور ان کے مفہوم واضح کرنے اور سمجھانے والے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اب یہ کام علمائے دین کا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی شخصیت کو اس کے علم کی وجہ سے بڑا بنا کر اپنے آپ کو اس کے ساتھ وابستہ کر لیں، اس کی ہر بات کو دلیل مان لیں اور سمجھیں کہ جو وہ کہتے ہیں وہی حق ہے، یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ دعوت الی اللہ کے حوالے سے یہ ساری باتیں سمجھنا بہت ضروری ہے۔

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: ''اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' یعنی میرا کوئی متبع شرک نہیں کرے گا۔ سب اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے والے ہوں گے اور یہ وہی کام کریں گے جو میں نے کیا ہے۔ میں شرک کے قریب نہیں گیا تو یہ سارے بھی اس ظلم سے بچیں گے۔ میں نے جس علم کو پیش کیا ہے میری اتباع کرنے والے اسے ہی دعوت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔

آیت 109 وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ . . . .: اس آیت میں متعدد مسائل بیان ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنے نبی مبعوث فرمائے سب کے سب مرد تھے۔ کسی عورت کو اللہ نے نبوت عطا نہیں فرمائی بلکہ اس سلسلہ میں سب عورتوں کو مردوں کے تابع کیا ہے۔ انسانوں کی طرح

فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۹

تو کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں، پس وہ دیکھیں کہ کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے آخرت کا گھر ہی سب سے بہتر ہے، تو کیا تم (پھر بھی) نہیں سمجھتے ۱۰۹

جنات کی طرف بھی انھی انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جن لوگوں نے جھوٹی نبوتوں کے دعوے کیے ان میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ ایک جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب نے اس سے شادی کی تھی۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ایسے کئی لشکر بھیجے کہ جنھوں نے سارے جھوٹے نبیوں کا صفایا کر دیا۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ رب العالمین نے کسی فرشتے کو نبی نہیں بنایا بلکہ سب نبی انسانوں میں سے تھے۔ سب نبیوں کی خوبی یہ تھی کہ ان پر رب تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی اور پھر یہ بھی نہیں ہے کہ کسی نبی نے خود اپنے طور پر نبوت کا اعلان کر دیا ہو۔ وحی کے بغیر کوئی نبی ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک بار پھر یہ بات دہرائی ہے کہ اے نبی! اس قدر شان دار اور واضح دلائل سننے اور دیکھنے کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ نے پریشان نہیں ہونا اور اپنے کام کو جاری رکھنا ہے۔ یہ زمین میں چلتے پھرتے ہیں، تجارتی سفر کرتے ہیں لیکن سورج، چاند، ستاروں اور آسمانوں و زمین کے نظام کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے۔ اسی طرح یہ عاد و ثمود کی بستیاں بھی دیکھتے ہیں لیکن ان بستیوں کی تباہی کے آثار دیکھ کر بھی انھیں ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

نبوتوں کے انکار کے حوالے سے خرابی کی اصل جڑ آخرت کو بھول کر دنیا کو مطمح نظر بنا لینا ہے۔ مادہ پرستی کی وجہ سے قوموں میں شرک اور عقائد و اعمال کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جب لوگ دنیا کی عزت، دولت اور عہدے کے پیچھے بھاگتے ہیں تو اس سے بے دینی اور بے حیائی کے سلسلے پروان چڑھتے ہیں۔ مٹیریل ازم (مادہ پرستی)، کیپٹل ازم (سرمایہ دارانہ نظام) اور کمیونزم (اشتراکیت) ایسے تمام فلسفوں کی بنیاد مادہ پرستی پر قائم ہے اور یہ چیز دین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آخرت ان لوگوں کو ملے گی جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم آخرت کو بطور عقیدہ مانتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ صرف عقیدے کے دعوے پر جنت نہیں ملے گی۔ عقیدہ صحیح معنوں میں وہی ہوتا ہے جو عمل کا سبب بنے۔ مفسرین نے اس حوالے سے بیج اور اس کے اندر سے نکلنے والے پودے کی مثال دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایمان بیج ہے۔ جتنے بڑے بڑے درخت

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ

یہاں تک کہ جب رسول نا اُمید ہو گئے اور انھوں نے گمان کیا کہ ان سے یقیناً جھوٹ بولا گیا ہے تو ان کے پاس ہماری مدد

ہوتے ہیں یہ پہلے بیج میں ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ عقیدے اور ایمان کے ساتھ ساتھ اصل چیز عمل ہے۔ جب عقیدہ صحیح ہو گا تو اس کے اندر سے نکلنے والا عمل بھی صحیح ہو گا۔

وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ : جس کے پاس تقویٰ ہو گا، جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہو گا اور جس کے دل میں آخرت کا خوف ہو گا وہ ہدایت حاصل کر لے گا۔ یعنی کتاب اور ہدایت سب کے لیے ہے لیکن اسے حاصل متقین ہی کریں گے۔ تقویٰ گناہ اور نافرمانی سے بچنے کو کہتے ہیں۔ انسانوں کو قدم قدم پر ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ وہ گناہ پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی سوچ یہ ہونی چاہیے کہ ان کی آخری سانس بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شریعت پر عمل کرتے ہوئے نکلے۔ یہ ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے۔ صحیح معنوں میں ایمان لانے والا شخص وہ ہے جس کا عمل اس کے ایمان کی گواہی دیتا ہے۔ ایک بندہ ایمان لانے کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن وہ سود خور ہے، جھوٹ بولتا ہے، لوگوں پر ظلم کرتا اور ان کے حق غصب کرتا ہے تو اس کا دعویٰ ناقص ہے۔

جس شخص کا آخرت پر صحیح ایمان ہے وہ کبھی کسی کا حق غصب نہیں کرے گا اور ایسا شخص زنا، قتل، چوری اور دوسرے جرائم میں ملوث ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر کسی شخص میں تقویٰ نہیں ہے اور نافرمانیوں کا مرتکب ہونا اس کی زندگی کا طرہ امتیاز بن چکا ہے تو سمجھ لیں کہ عقیدۂ آخرت پر اس کا ایمان صحیح نہیں ہے۔ آخرت میں بھلائی اور کامیابی اسے ملے گی جو تقویٰ اختیار کرے گا اور عمل کے اعتبار سے رب تعالیٰ کی ہر نافرمانی سے خود کو محفوظ رکھے گا۔ عقل مند شخص اسے ہی سمجھا جائے گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں زندگی بسر کرتا اور غلطیوں کی صورت میں توبہ کر کے اپنا مستقبل محفوظ کرتا ہے۔ مومن کا مستقبل اللہ رب العالمین کی جنت کا حصول ہوتا ہے۔ یہ بات اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سکھائی ہے۔

آیت 110 حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ : اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرما رہے ہیں کہ پہلے جو نبی اور رسول اس دنیا میں مبعوث ہوئے آپ ذرا ان کی تاریخ پر نظر ڈالیں، قوموں کی طرف سے ان کی اتنی زیادہ مخالفت کی جاتی رہی ہے کہ وہ مایوس ہو جاتے تھے کہ ان لوگوں نے کسی صورت ماننا نہیں ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رسول مایوس ہوتا ہے؟ ظاہر ہے نبی بھی انسان ہیں۔ جب بہت زیادہ محنت کرنے کے بعد بھی لوگ نہیں مانتے اور واضح دلائل سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تو دل میں گمان اور وسوسے کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ انسان ہونے کے ناتے نبیوں کے

مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾

آ پہنچی، پھر ہم جسے چاہیں نجات دے دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا ﴿110﴾

دل میں بھی یہ احساس ہوسکتا ہے، اس لیے اللہ رب العالمین فرما رہے ہیں کہ اے نبی! ایک خیال کے دل میں آ جانے پر آپ نے مایوس اور پریشان ہو کر نہیں بیٹھنا۔ یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ دل میں کسی خیال کے آ جانے پر پکڑ نہیں ہے۔ خیال ہر کسی کے دل میں پیدا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر مواخذہ نہیں کرتا۔

طویل عرصہ تک دعوت دینے کے بعد بھی لوگوں کے ایمان نہ لانے پر نبیوں کے دل میں بھی احساس پیدا ہوا، لیکن اصل چیز یہ ہے کہ وہ مایوسی گناہ ہے جس کے ساتھ انسان اپنا کام ہی چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ کسی نبی کے متعلق تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے مایوس اور نا امید ہو کر اپنا مشن چھوڑ دیا ہو، البتہ یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم جب ساڑھے نو سو سال تک دعوت دینے کے بعد بھی ایمان نہیں لائی تو اس وقت انھوں نے بد دعا ضرور کی تھی۔ ایسے ہی دوسرے انبیاء علیہم السلام کے تذکرے بھی قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ ساری باتیں بیان کر کے اپنے نبی کو تسلی دے رہے ہیں کہ جب پریشانی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اس وقت رب تعالیٰ کی مدد ضرور آتی ہے۔ آپ کے لیے بھی یہ وقت آنے والا ہے۔

وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا: ''اور انھوں نے گمان کیا کہ ان سے یقیناً جھوٹ بولا گیا ہے۔'' اس کی مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ انکار کرنے والے عام لوگوں نے یہ گمان کیا کہ نبیوں نے ان کے ساتھ جھوٹ بولا ہے اور ان کی طرف سے ہمیں جو دعوت پیش کی جاتی رہی وہ درست نہیں تھی۔ [تفسیر الطبري: ۱۳/ ۳۸۳] وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم یہ بات ماننے والے نہیں ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ اگر آپ رب تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں تو اس کے لیے کوئی نشانی دکھائیں۔ دوسری تفسیر اس کی یہ ہے کہ جنھوں نے نبی کی دعوت کو قبول کیا ان کے دلوں میں بھی وسوسہ پیدا ہونے لگا کہ شاید کفار پر عذاب آنے کی بات ان سے جھوٹ ہی کی گئی تھی۔ ظاہر ہے جس پریشانی میں نبی مبتلا ہوتے تھے اسی پریشانی میں نبی پر ایمان لانے والے ان کے ساتھی بھی ہوتے تھے۔

تیسری تفسیر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے اللہ کے اس فرمان ﴿ حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ ﴾ کے متعلق سوال کیا، عروہ رحمہ اللہ نے کہا: میں نے پوچھا: کیا یہ لفظ '' كُذِبُوْا '' ہے یا '' كُذِّبُوْا '' ؟ (ذال کی تشدید کے ساتھ ہے یا اس کے بغیر؟) انھوں نے کہا: '' كُذِّبُوْا '' ہے۔ میں نے کہا: نہیں اس کا تو یقین تھا کہ ان کی قوم نے انھیں جھٹلا دیا ہے، سو وہ گمان تو نہیں تھا، انھوں نے کہا: ہاں! مجھے اپنی عمر کی قسم! واقعی انھیں اس کا یقین ہو گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا: (کیا یہ ہوسکتا ہے) کہ انھوں نے گمان کیا کہ ان سے

جھوٹ کہا گیا تھا؟ انھوں نے کہا: اللہ کی پناہ! رسول اپنے رب کے بارے یہ گمان نہیں کرتے تھے۔ میں نے کہا: پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے کہا: یہ رسولوں کے پیروکار تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور رسولوں کی تصدیق کی، ان پر لمبی آزمائش آئی اور (اللہ کی) نصرت نے ان سے بہت دیر کی، یہاں تک کہ جب رسول اپنی قوم کے ان لوگوں سے بالکل ناامید ہو گئے جنھوں نے انھیں جھٹلا دیا تھا اور رسولوں نے گمان کیا کہ ان کے پیروکار بھی انھیں جھٹلا چکے ہیں تو اس وقت ان کے پاس اللہ کی مدد آ گئی۔ [صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب قوله: ﴿حتى إذا استيأس الرسل﴾: ٤٦٩٥] یہ مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں لیکن ترجیح ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کو دی گئی ہے کہ کافر اس بات کا گمان کرتے تھے کہ نبیوں نے ہمارے ساتھ جھوٹ بولا ہے اور وہ اسی بات کا پروپیگنڈا کرتے تھے۔ بہرحال دوسری بیان کی گئی تفسیروں کا بھی انکار نہیں ہے، کیوں کہ یہ تفسیریں بھی ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے کی گئی ہیں کہ جن کے اقوال تفسیر میں قبول کیے جاتے ہیں۔

جَآءَهُمْ نَصْرُنَا: کفار ومشرکین کی طرف سے انکار انتہا درجے تک پہنچنے پر جب نبیوں کو مایوسی ہوئی تو اللہ رب العالمین کی مدد اسی وقت آ گئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے نبی! آپ کو بھی ہم ایسے ہی مدد سے نوازیں گے اور پھر خالقِ کائنات نے وہ مدد کر کے بھی دکھائی۔ نوح علیہ السلام اور بعض دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ادوار میں اللہ کی مدد ظالموں پر عذاب کی صورت میں آئی جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حالات یہ تھے کہ آپ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور سارے مشرک و کافر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہیں اور اکثر و بیشتر اسلام قبول کرنے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد کے ذریعے سے حق واضح کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم طواف کرنے کے بعد بتوں کو چھڑی سے مارتے جا رہے تھے اور فرما رہے تھے: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ [بني إسرائيل: ٨١] ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔'' [صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب فتح مكة: ١٧٨٠] اس سے پتا چلتا ہے کہ اللہ کی مدد مختلف طریقوں سے آتی رہی ہے۔ اُحد میں مسلمانوں کو بہت زیادہ شہادتوں کا سامنا کرنا پڑا، ایسے میں جب اللہ کی مدد آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ ہم کفار کا پیچھا کریں گے۔ [دیکھیے صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب ﴿الذين استجابوا لله ...﴾: ٤٠٧٧] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا پیچھا شروع کیا تو مکہ والے جن کا ارادہ دوبارہ مدینہ کی طرف آنے کا تھا وہ مکہ کی طرف بھاگ نکلے۔ [مغازي الواقدي: ١/ ٣٣٨] خندق کے موقع پر بھی مسلمانوں کو سخت مشکل صورتِ حال کا سامنا تھا لیکن پھر اللہ کی مدد آئی تو حالات بہتر ہوتے چلے گئے۔ گویا ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ مایوسیاں چھا جاتی ہیں اور پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ درحقیقت یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ جب استقامت دکھانے پر اللہ کی مدد آتی ہے۔ رب تعالیٰ نے اپنے نبی اور ان کے ساتھیوں کو یہ بات سمجھائی ہے کہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اور معاملہ کسی بھی انتہا تک پہنچ جائے، تیرے رب کی مدد ہر صورت میں آ کر رہے گی۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ
تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ع ۱۲

بے شک ان کے قصوں میں عقل والوں کے لیے بڑی عبرت ہے، یہ ایسی بات نہیں جو بنالی جائے اور لیکن یہ تصدیق ہے اس کی جو اس سے پہلے تھی اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے سراپا ہدایت اور رحمت ہے، جو ایمان لاتے ہیں ﴿۱۱۱﴾

فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ : ''پھر ہم جسے چاہیں نجات دے دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جا سکتا۔'' اللہ تعالیٰ کا عذاب مجرموں پر آ کر رہتا ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا۔ اللہ رب العزت کا اپنا ایک نظام ہے، جب وہ حرکت میں آتا ہے تو دوسرے سب سلسلے ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنی طرف سے بڑی تدبیریں کرتا ہے اور حکومتیں بہت کچھ کرتی ہیں لیکن اللہ کے فیصلوں کے سامنے کوئی چیز دم نہیں مار سکتی۔

آیت 111 ﴿ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ : یوسف علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کے قصے بیان کرنے کا مقصد ان سے ہدایت اور نصیحت حاصل کرنا ہے۔ قرآن مجید ہدایت کی کتاب ہے۔ یوسف علیہ السلام کا قصہ اتنا جامع ہے کہ اس میں معاشروں کی اصلاح اور حکومتی امور کے حوالے سے بہترین رہنمائی ملتی ہے۔ ایسے ہی ایک شخص اگر اپنی عزت بچانا اور اپنے ایمان کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی مکمل رہنمائی موجود ہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں اور صبر کیسے کیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے بہت زیادہ نصیحت رکھی ہے۔ اس لیے قرآن مجید میں جب ان قصوں کو پڑھا جائے تو ان سے رہنمائی، نصیحت اور عبرت حاصل کی جائے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ رب العالمین نے قرآن میں عقل والے قرار دیا ہے۔ جو لوگ ان واقعات کو پڑھ کر بھی عبرت اور نصیحت حاصل نہیں کرتے وہ صحیح سمجھ بوجھ اور عقل نہیں رکھتے۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى . . . : اللہ رب العالمین کی طرف سے قرآن میں بیان کردہ یہ واقعہ کوئی بناوٹی چیز نہیں ہے کہ نبی نے اپنے پاس سے بیان کر دیا ہو۔ کسی نبی نے اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں بنائی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب ہے جو تورات، انجیل اور دوسری پہلی کتب کی تصدیق کرتی ہے۔ گویا تورات اور انجیل کی بھی وہ بات صحیح ہے جس کی تصدیق قرآن کرتا ہے اور جس کی تصدیق قرآن نہ کرے لازمی طور پر وہ تحریف شدہ ہے اور

لوگوں کی اپنی طرف سے بنائی ہوئی ہے۔قرآن مجید کا دوسری الہامی کتب کی تصدیق کرنا بھی بہت بڑی دعوت ہے۔ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: ''اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے سراپا ہدایت اور رحمت ہے، جو ایمان لاتے ہیں۔'' جن لوگوں کا قرآن پر ایمان نہ ہو انھیں کبھی ہدایت نہیں ملتی۔ ایسے لوگ ہمیشہ تاویلیں کرتے اور قرآن کی آیات کا غلط معنی ومفہوم بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کے مقدر میں گمراہیاں ہی ہوتی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کی نیت خراب اور مقاصد غلط ہوتے ہیں۔قرآن مجید سراپا ہدایت ہے۔ جو کوئی اس سے ہدایت حاصل کرتا ہے وہ رب تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں رہتا ہے۔ اسے دنیا میں بھی فائدے ملتے ہیں اور آخرت میں بھی اسے بہترین اجر سے نوازا جائے گا، البتہ یہ ساری چیزیں ایمان سے متعلق ہیں۔ آخرت میں حقیقی کامیابی ایمان والوں کو ہی ملے گی۔